

فارسی کا فراموش شدہ صاحب دیوان شاعر۔ حمید الدین فراہی

Dr. Shahid Nokhaiz Aazmi

Department of Persion, Molana Azad National Urdu University, Hayderabad, India

Hameed-ud-Din Frahi: An elapsed Persian Poet

Hamiduddin Farahi (1863-1930) was a celebrated Islamic scholar of Indian subcontinent known for his groundbreaking work on the concept of Nazm, or Coherence, in the Quran. He proved himself to be an expert in Arabic and Persian languages, he learnt Hebrew as well.

The two prominent aspects of the person of Farahi are of a scholar and a literary figure. Though his scholarly aspect over shadowed his literary figure but his works bore witness that he could composed poetry both in Arabic and Persian languages in the style of the classical Persian poets even when he was only sixteen years old.

This talent devolved, perhaps, under tutelage and the influence of renowned scholar and his teacher and his cousin Shibli Nu'mani who played much in shaping carving and early flowering of his literary taste and acumen. The author of this article presents a detailed review of Frahi's Persian Divan.

حمید الدین فراہی ۱۸ نومبر ۱۸۶۳ء چہار شنبہ کی صبح کو اعظم گڑھ کے ایک معروف گاؤں پھر یہاں میں پیدا ہوئے فراہی نسبت کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ یہ پھر یہاں کو عربی شکل دیکر بنائی گئی ہے اور یہ ان کے مسکن کو ظاہر کرتی ہے لیکن ایک دوسری تحقیق کے مطابق یہ افغانستان کے ایک مقام 'فراہ' کی جانب منسوب ہے جہاں سے یہ خاندان منتقل ہو کر ہندوستان آیا تھا۔ حمید الدین فراہی کے والد کا نام مولوی عبدالکریم تھا جو مغرب و مشرق کی تعلیم سے آراستہ اور قانون کے گریجویٹ تھے حمید الدین فراہی کی ولادت اور وطن کے متعلق سید سلیمان ندوی 'حمید الدین فراہی حیات و افکار' کے صفحہ نمبر ۶۴ میں رقمطراز ہیں:

”اعظم گڑھ سے دوایشن پہلے پھر یہاں ایک گاؤں ہے وہی مولانا کا پدری وطن تھا اسی پھر یہاں کو عربی شکل دیکر مولانا اپنے نام کے ساتھ کبھی کبھی فرہای لکھا کرتے تھے، مولانا شبلی مرحوم دونوں میرے پھوپھیرے بھائی تھے مولانا فرہای کے والد عبدالکریم صاحب علامہ شبلی کے ماموں تھے دونوں بھائیوں کی پیدائش چھ برس آگے پیچھے ہوئی مولانا شبلی ۱۲۷۵ھ، ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے اور حمید الدین صاحب ۱۲۸۰ھ ۱۸۶۳ء میں پیدا ہوئے۔“

حمید الدین فرہای نے ناظرہ قرآن و حفظ قرآن اور فارسی زبان کی ابتدائی تعلیم مولوی محمد مہدی چٹاروی سے حاصل کی ہے اور اپنے عزیز خاص نعمانی سے فارسی زبان کی تکمیل کی اور اسی دوران ممتاز عالم مولانا فاروق چریا کوٹی کی عالمانہ صحبتیں بھی نصیب ہوئیں جس سے انکی صلاحیتوں میں نکھار پیدا ہوا مولانا کی تعلیم کیلئے بارے میں مولانا سید سلیمان ندوی یاد رفتگان صفحہ ۱۱۳ پر لکھتے ہیں:

”مولانا نے حفظ شروع کیا اور قرآن مجید کے حافظ ہوئے اور فارسی کی ابتدائی کتابیں اسی ضلع کے ایک دیہات چتارہ کے باشندے مولوی مہدی حسین صاحب سے پڑھی اس زمانہ میں شرفاء کی تعلیم کا فارسی ادب سب سے اہم جز تھا مولانا کو ادبیات سے فطری لگاؤ تھا چنانچہ فارسی زبان اور فارسی ادب کا ذوق بچپن سے ہی انکے اندر نمایاں تھا اس وقت مولانا شبلی مرحوم عربی کی اعلیٰ کتابیں اعظم گڑھ میں مولانا فاروق چریا کوٹی سے پڑھ رہے تھے مولانا فاروق صاحب نے اپنے عہد کے سب سے بڑے عالم ہونے کے ساتھ فارسی کے بھی بہت بڑے ادیب اور استاد تھے حمید الدین صاحب کی آمد و رفت یہاں بھی رہا کرتی تھی اور یہ عالمانہ صحبتیں انکو ملا کرتی تھیں۔“

فارسی تعلیم حاصل کرنے کے بعد فرہای نے عربی تعلیم حاصل کرنی شروع کی علامہ شبلی نعمانی سے اسکی ابتداء کی علامہ شبلی نعمانی کے چلے جانے کے بعد حمید الدین فرہای نے لکھنؤ جا کر فرنگی محل میں مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محل سے تعلیم حاصل کی اس کے بعد مدرسہ اسلام کراچی سے ان کی ملازمت کا سلسلہ شروع ہوا جہاں وہ ۱۸۹۷ء میں عربی کے استاد مقرر ہوئے اور جنوری ۱۹۰۷ء تک یہاں مقیم رہے اور اسی دوران انکے کلام کا پہلا مجموعہ ’دیوان حمید‘ کے نام سے شائع ہوا اسکے بعد مولانا حمید الدین علی گڑھ چلے آئے اور فروری ۱۹۰۷ء میں ایم۔ اے۔ او۔ کالج کے شعبہ عربی کے اسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے اسی شعبہ کے پروفیسر اور صدر جرمن کے مشہور عالم جوزف نے مولانا سے عربی زبان و ادب کے میدان میں استفادہ کیا۔ اور مئی ۱۹۰۸ء تک یہاں مقیم رہے۔

۱۹۰۸ء میں مولانا حمید الدین فرہای علی گڑھ سے الہ آباد چلے آئے اور میور کالج میں ۱۹۱۳ء تک عربی کے پروفیسر رہے تدریسی مصروفیات کے ساتھ ساتھ تصنیفی و تالیفی سرگرمیاں بھی یہاں جاری رہیں مواءظ سلیمانی کے منظوم فارسی ترجمہ خرد نامہ کی ابتداء اسی زمانے کی پیداوار ہے۔

فرہای اسی زمانے میں عربی و فارسی اردو اور ہندی کے بورڈ آف انڈس کے رکن منتخب ہوئے اسی اثناء میں ریاست حیدرآباد نے مولانا فرہای کی خدمات دارالعلوم حیدرآباد کی پرنسپل شپ کیلئے حاصل کی اور یوپی حکومت کی جانب سے جون ۱۹۱۳ء میں حیدرآباد منتقل ہو گئے اور وہاں ۱۹۱۹ء تک مقیم رہے اگست ۱۹۱۹ء میں مولانا فرہای دارالعلوم حیدرآباد کی ذمہ داریوں سے سبک دوش ہو گئے اور اپنے وطن اعظم گڑھ چلے آئے اور اپنی عمر کا باقی حصہ مدرسہ اصلاح سرائے میر کی خدمت میں گزارا اور اسکی خدمت کا ایسا حق ادا کیا کہ یہ مدرسہ انہیں کی نسبت سے مشہور و معروف ہوا مولانا فرہای ابتدائی دور سے ہی اس مدرسہ سے وابستہ تھے اور ۱۹۱۳ء میں اسکے باضابطہ ناظم منتخب ہوئے اور اس مدرسہ کی تعمیر و ترقی اور اسکی تعلیمی سرگرمی کو آگے بڑھانے میں مولانا فرہای کی خدمات بہت ہی نمایاں اور قابل قدر ہیں۔ مولانا نے طلبہ و اساتذہ میں قرآن فہمی کا ذوق پیدا کیا اور ایک ایسی ٹیم تیار کی جو ان منفرد نظر و فکر اور تدریس کو رواج دے سکے اور فکر فرہای کی شارح و ترجمان بن سکے ان میں مولانا اختر احسن اصلاحی، مولانا امین احسن اصلاحی، خصوصی ذکر کے مستحق ہیں ۱۹۱۷ء میں مولانا فرہای نے فریضہ حج ادا کیا اور حجاز میں قیام

کے دوران بہت سے علماء سے ملاقات ہوئی جن میں علامہ تقی الدین ہلالی، اور مولانا عبداللہ سندھی بھی شامل تھے۔ حج سے واپس ہونے کے بعد مولانا مدرسہ کی خدمت اور اپنے تصنیفی و تالیفی کاموں میں بدستور مصروف رہے۔ ۱۱ نومبر ۱۹۳۰ء کو اپنے وطن سے دور مٹھرا شہر میں انہوں نے وفات پائی اور وہیں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ مٹھرا میں انتقال کے متعلق سید سلیمان یادرفنگاں، صفحہ ۱۱۱ پر لکھتے ہیں:

”زندگی گمنامی میں گزاری، مرنے کے بعد بھی گمنامی کا گوشہ تلاش کیا۔ مٹھرا میں جہاں اپنے ایک ہموطن ڈاکٹر سے جو دس برس سے انکے معالج خاص تھے علاج کرانے تشریف لے گئے تھے۔ وہیں انتقال فرمایا عمر شریف سرسٹھ (۶۷) برس کے قریب تھی مگر دائمی درد سر کی شکایت کے سوا کوئی بہت اچھے تھے۔“

مولانا فراہی کی خصوصیات کا ذکر اور انتقال کا ماتم سید سلیمان وفات، معارف صفحہ نمبر ۵ پر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

الصلوٰۃ علیٰ ترجمان القرآن (بمصر قرآن کی نماز جنازہ) وہ صدرا ہے جو آج سے، ساڑھے چھ سو برس پیشتر مصر و شام سے چین کی دیواروں تک ابن تیمیہ کی نماز جنازہ کے لئے بلند ہوئی تھی حق ہے کہ یہ صدرا آج پھر بلند ہو اور ہندوستان سے مصر و شام تک پھیل جائے کہ اس عہد کا ابن تیمیہ ۱۱ نومبر ۱۹۳۰ء، جمادی الثانی ۱۳۴۹ھ، کو اس دنیا سے رخصت ہو گیا وہ جس کے فضل و کمال کے مثال آئندہ بظاہر حال عام اسلامی میں پیدا ہونے کی توقع نہیں جسکی مشرقی و مغربی جامعیت عہد حاضر کا معجزہ تھی عربی کا فاضل یگانہ اور انگریزی کا گریجویٹ اور زہد و اربع کی تصویر فضل و کمال کا مجسمہ فارسی کا بلبل شیراز عربی کا سوق عکاظ ایک شخصیت مفر دلیکن ایک جہاں دانش ایک دنیائے معرفت ایک کائنات علم ایک گوشہ نشین مجمع کمال ایک بے نوا سلطان ہنر علوم ادبیہ کا یگانہ علوم ادبیہ کا خزانہ علوم عقلیہ کا ناقد علوم دینہ کا ماہر علوم القرآن کا واقف اسرار قرآن کا دانائے رموز دنیا کی دولت سے بے نیاز اہل دنیا سے مستعفی انسانوں رد و قبول اور عالم کی داد و تحسین سے بے پروا گوشہ علم کا معتکف اور اپنی دنیا کا آپ بادشاہ وہ ہستی جو تیس برس کامل قرآن پاک اور صرف قرآن پاک فہم و تدبر اور درس و تعلیم میں محو ہونے سے بیگانہ اور شغل سے نا آشنا تھی افسوس کہ انکا علم انکے سینے سے سفینے میں بہت کم منتقل ہو سکا مسودات کا دفتر چھوڑا ہے مگر افسوس کہ اسکے چھپنے اور ربط و نظام دینے کا دماغ اب کہاں جو چند رسالے چھپے وہ عربی میں ہیں جن کے عوام کیا علماء تک نا قدر شناس ہیں انکی زندگی ہمارے لئے سرمایہ اعتماد تھی اور ان کا وجود دار المصنفین کیلئے سہارا تھا افسوس کہ اعتماد اور سہارا جاتا رہا اور صرف اسی کا اعتماد اور سہارا جاتا رہا اور صرف اسی کا اعتماد اور سہارا رہا گیا جس کے سوا اور کسی کا اعتماد اور سہارا نہیں اس سے زیادہ افسوس یہ ہے کہ یہ ہستی آئی اور چلی گئی لیکن دنیا انکی قدر و منزلت کو پہچان نہ سکی اور ان کے فضل و کمال کی معرفت سے نا آشار ہی۔

تو نظیری ز فلك آمدہ بودی جو مسیح

باز پس رفتی و کس قدر تو نشناخت دریغ

مولانا فراہی نابضہ عصر اور یگانہ روزگار تھے وہ ایک بیدار مغز اور روشن خیال اور دور میں انسان تھے ایسے جامع کمالات ہستی صدیوں میں یہ مشکل ہی پیدا ہوتی ہے ان کی ساری زندگی اسلامی شعرا کا نمونہ تھی انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ عوام اور علماء کے ذہن کو جلاء بخشی ہے انہوں نے ترجمہ تفسیر القرآن عربی و فارسی ادب، انگریزی زبان، علم کلام و فلسفہ، اور تعلیم و تربیت جیسے مختلف میدانوں میں اپنے فضل و کمال کے جوہر دکھائے ہیں انکے معیار تحقیق پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ترجمان القرآن، صفحہ ۹۶ پر لکھتے ہیں:

”علامہ فراہی ایک بڑے درجہ کے محقق تھے انہوں نے اپنی تفسیروں میں تفسیر کا ایسا خاص مجتہدانہ اسلوب اختیار کیا ہے جو دوسرے

مفسرین کے اسالیب سے بہت کچھ مختلف ہے انکی تحقیقات میں ایسا پیش بہا خزانہ پایا جاتا ہے جن سے کوئی طالب بے نیاز نہیں ہو سکتا۔“

علامہ فراہی کی اصل یادگار ان کا وہ گرانقدر تصنیفی و تالیفی سرمایہ ہے جو تفسیر اصول تفسیر، نظم قرآن، تاریخ قرآن، منطق، حکمت،

فلسفہ، اور شعر و شاعری جیسے مختلف موضوعات سے تعلق رکھتا ہے۔ انکی بہت سی کتابیں ہنوز زبویطبع سے آراستہ نہیں ہوئیں انہوں نے اپنی زیادہ تر تصانیف میں قرآن کریم سے دلیلیں پیش کی ہیں انہوں نے قرآن کو بنیاد اور مرکز بنا کر دیگر تمام علوم کو اسی کے ماتحت کیا ہے مولانا فراہی کے اس تجزیل کی ایک نہایت دلنیش تعبیر مولانا عنایت اللہ سبحانی صاحب 'الاصلاح' صفحہ ۱۱۲ پر کے ان الفاظ میں ملتی ہے:

”تصنیف و تالیف کے میدان کا میں یہ پہلا شہسوار ہے جس کی پہلی اور آخری آرزو یہ تھی کہ قرآن پاک کو بزم علم کا صدر نشین بنایا جائے مسلمانوں کے یہاں جتنے بھی علوم ہیں ان سب کا مرکز و منبع کتاب الہی کو قرار دیا جائے اس کی روشنی میں از سر نو سارے علوم مدون کئے جائیں وہ علوم فنون کیا ایک ایسی دنیا بنا چاہتے تھے جس کے سارے سیارے آفتاب قرآنی کے گرد گردش کرتے ہوں۔“

مولانا فراہی کے متعلق مولانا امین احسن اصلاحی 'مختصر حیات حمید' صفحہ ۵۱ پر رقم طراز ہیں:

”وہ محض ایک مذہب کے محقق اور مصنف نہیں تھے بلکہ ان کی تمام فکری کاوشوں کے اندر ایک گہرا جزبہ اصلاح کام کر رہا تھا وہ علمی اصلاح سے پہلے فکری اصلاح کو ضروری سمجھتے تھے اور اس فکری اصلاح کی بنیاد انہوں نے قرآن پر رکھی“

ان تمام خوبیوں اور خصوصیات کے علاوہ ایک اور خصوصیت مولانا کی شخصیت میں تھی کہ وہ شعری ذوق بھی رکھتے تھے لیکن ان کی علمی نثر نے اسے پس پردہ کر دیا مولانا فراہی عربی اور فارسی میں صاحب دیوان تھے اور انکے فارسی دیوان کو دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا غزل، قصیدہ، مثنوی وغیرہ جملہ اصناف سخن پر قادر تھے چونکہ مولانا نہایت سادہ مزاج تھے اسلئے ان کے کلام میں جوش و مستی، شوخی و رعنائی کا عنصر کم ملتا ہے اور ان کی شاعری سادگی میں بھی دلفریب ادائیں پوشیدہ رکھتی تھیں اور یہ تمیز کرنا ناممکن ہوتا ہے کہ یہ کلام ہندی نژاد کا ہے یا کسی ایرانی شاعر کا۔ ایران کے قدیم اساتذہ فن کی تمام خوبیاں مولانا کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ علامہ شبلی جو فارسی کے بہت بڑے مصنف اور کاتب شاعر تھے وہ بھی فراہی کی فارسیت کا اعتراف کرتے تھے اور خود پر شاگرد کو ترجیح دیتے تھے۔

ابھی مولانا فراہی کی عمر صرف سولہ برس کی تھی کہ انہوں نے فارسی کے سب سے مشکل گوشاعر خاقانی شروانی کے تتبع میں سلطان عبدالرحمن کی مدح میں یہ قصیدہ لکھا جب یہ قصیدہ علامہ شبلی نے اپنے استاد مولانا فاروق چریا کوٹی کو دکھا کر پوچھا کہ آپ کے نزدیک یہ کس کا کلام ہے تو انہوں نے فرمایا کہ یہ تو نہیں بنا سکتا مگر قدام میں سے کسی کا معلوم ہوتا ہے علامہ شبلی نے فرمایا حمید کا ہے وہ سن کر حیران رہ گئے۔

قصیدہ کے تمہید کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

بے جلوہ رخ تو بود مضطر آئینہ

خارا بگند بہ پیرین از جوہر آئینہ

گیسوئے ہمچو شب تو بیار امے دہم بصبح

فرمائے تا بیاورد از خاور آئینہ

تمہید کے بعد سلطان کی تعریف و مدح کا آغاز اس طرح کرتے ہیں:

سلطان دین خلیفہ عبد الحمید خان

کش مثل در جہاں نبود جز در آئینہ

چشم جہاں ز خاک در شاہ نوروز

بگرف آنچاں کہ ز خاکستر آئینہ

مولانا فراہی کے کلام کی نمایاں خصوصیت ان کی سادگی ہے اور انہیں کوئی شہ نہیں کہ جو کوشش اور حسن سادگی میں ہوتا ہوتا ہے وہ

کسی مصنوعی نقش آرائی یا رنگین بیانی میں نہیں ہوتا ان کے دیوان میں صرف یہ ایک ہی قصیدہ ہے اور بالکل ہی نوعمری میں لکھا گیا ہے۔
 مولانا فراہی کی ایک بڑی بہن تھیں جنہوں نے مولانا کی پرورش و تربیت کی تھی ان کی وفات سے مولانا کو بہت صدمہ ہوا چنانچہ
 مولانا نے اپنے درد و غم کا اظہار ایک مرثیہ میں کیا ہے جو کہ انتہائی پردرد اور اثر انگیز ہے، تمہید کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کشیدہ اند بریں بوستان ز خون رقمے
 کہ ہیچ گل نبری برے گزند خار غمے
 ز بنک دہد چہ خروشم کنونکہ روز بخشت
 برفت ہر سر مہر یک ز نیک دہد قلمے
 ز بیش و کم گلہ از دور آسمان چہ کنم
 کہ در کفش نبود ذرہ ز بیش و کمے
 یہ بین چہ درد و مرا نیشتر بجان ز فراہ ست
 کہ مرگ خوابدم آتش بجان و مان زدہ است
 بہن نے جس والہانہ محبت اور دلسوزی کے ساتھ بھائی کی خدمت کی تھی اس کا اظہار دوسرے بند میں اس طرح فرماتے ہیں:

چہ شکر گوش اے دل کہ حق خدمت او
 ز شید مام فزون ست و سایہ پدرم
 ہر آنچه بود ز خوشخوئی و نکو کاری
 بدست تربیت خود سرشت با گہرم

علامہ فراہی کے یہ اشعار درد و غم میں ڈوبے ہوئے ہیں اور ان اشعار میں ان کی غمزدگی صاف نظر آتی ہے اور یہی شاعری کا کمال ہے کہ جو جز بہ جس طرح دل میں پیدا ہوا اسی طرح بنا کسی تکلف کے بیان ہو جائے علاوہ جزبات و احساس کی شدت کے خالص زبان کی لطافت، صفائی، سادگی اور پاکیزگی کے لحاظ سے بھی یہ مرثیہ انتہائی بلند پایہ اور مثالی ہے۔

مولانا فراہی کے دیوان میں غزلوں کی تعداد زیادہ ہے اور ان غزلوں کی روانی و سلاست اور پاکیزگی سے انکی غیر معمولی ذہانت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے آغاز شباب ہی میں حافظ اور نظیری وغیرہ کی غزلوں پر غزلیں لکھیں۔
 خواجہ حافظ کی ایک مشہور غزل ہے:

ساقی بیار بادہ کہ ماہ صیام رفت
 درد قدح کہ موسم ناموس و نام رفت
 اس غزل پر مولانا فراہی نے ایک غزل اس طرح لکھی ہے:

از من بکوئے زاق فروشان پیام رفت
 کاندرا سرم ہواے مے لعل و فام رفت
 این نہ عمر خود نہ مہ پختہ می دھم
 کان نحیہ دگر بہ ہو سہائے قام رفت

من از کمند حلقه واعظ رمیدہ ام
 دل خستگیش ہیں کہ سکارش فردام رفت
 بس آفت خمار کشیدی حمید من
 ہا بر مر آ بادہ صافی بجام رفت
 اس غزل کی سلاست و روانی و شیرینی یہ بتاتی ہے کہ یہ کسی اہل زبان کی غزل ہے اور خاص کر حافظ کی غزلوں کے رنگوں میں ڈوبی
 ہوئی ہے لیکن یہ ایک ہندی نژاد حمید الدین فراہی کی غزل ہے۔

فراہی کے کمال کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کے کلام میں عربی الفاظ بہت ہی کم ہیں جبکہ یہ عربی کے ایک عالم اور شاعر
 بھی ہیں اور اس زمانے میں عربی لفظ فارسی سے بہت زیادہ مخلوط ہو گئے تھے ان کو الگ کر کے کلام میں فصاحت کو قائم رکھنا بہت مشکل تھا لیکن
 عربی الفاظ نہ ہونے کے باوجود ان کے کلام میں فصاحت و سلاست ہمیشہ قائم و دائم رہی۔ خواجہ حافظ کی غزل کا ایک مطلع ہے:

بلبل ز شاخ سرو بگللیا رنگ پہلوی
 می خواند دوش درس مقامات معنوی
 اس غزل پر فراہی نے ایک غزل سادہ فارسی میں لکھی ہے، پیش خدمت ہے:
 در با مداد خواجہ بہ کہ لعنوی
 تابش نوی ز مرغ نوابائے پہلوی
 بر خیزد باز بین کہ گلستان برونگ بوست
 تا چشم را نواد ہی و مغز را نوی
 گیرد سبک شری کم شوریدہ رہرواں
 آگاہ نیست آنکہ ز آئین رہروی
 گفتار حفظ ار چہ رواں تازہ می کند
 ہم گفتمہ حمید دہد ہوش را نوی
 یہ پوری غزل سادہ اور شگفتہ فارسی میں ہے اور اس میں ایک بھی لفظ عربی کا نہیں ہے لیکن بندش کی چستی اور انداز کی لطافت بدستور
 قائم ہے بلاشبہ یہ غزل گفتار حافظ کی یاد تازہ کرتی ہے۔
 حافظ شیرازی کے علاوہ نظیری نیشاپوری کی زمین میں بھی مولانا فراہی نے غزل لکھی ہے ان غزلوں میں بھی ان کی لطافت زبان کا
 یہی عالم نظر آتا ہے۔
 ایک شعر نظیری نیشاپوری کا پیش ہے:

دعا کند بوقت شہادتہم او را
 کہ این دمے است کہ درہائے آسماں باز است
 اس زمین میں مولانا فراہی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:
 چوں از دلم بدش صدرہ نہاں باز است

چہ غم از اینکہ بہ ندیش رازیاں بازست
 تو غم فرستی و من خرد ہائے جان و خوشم
 کہ درمیانہ ماراہ ارمغان باز است
 ہزار خمکدہ خون جگر زیاں کردم
 دیہان دیدہ بہ خمیازہ ہمچنان باز است
 عام طور پر غزل گو شعراء کے کلام میں تسلسل خیال کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں لیکن فرہای صاحب نے اکثر غزلوں میں تسلسل خیال سے کام لیا ہے جس سے کلام کی دلآویزی بڑھ گئی ہے مثلاً ایک ہی غزل میں دوست کو مخاطب کر کے زندگی کے مختلف حالتوں کی طرف توجہ دلائی ہے غزل کے طند اشعار ملاحظہ ہوں:

نگار من ن نفسی لطف گلستان دریاب
 ہر آنچه سبزہ و گل می دید نشان دریاب
 ترانہ سنجی مرغان بوستان بشتنو
 جگر خراش فغان ہائے دوستان دریاب
 بدست ناز سر نرگس جوان ہر کس
 خمار بادہ گساران سرگران دریاب
 نخست گرمی ہنگامہ بہاراں بیش
 سپس فسر دگی موسم خزان دریاب
 حمید گرم ز خود آستیس فشان بر خیز
 ہنوز دور نرفت مسست کاروان دریاب
 ان غزلوں میں مولانا فرہای کی فارسیت اور قدرت زبان کا حیرت انگیز عالم ہے جس کی مثال کسی ہندی نژاد شاعر میں بمشکل ہی ملتی ہے مولانا فرہای نے اکثر غزلیں چھوٹی چھوٹی جڑوں میں لکھی ہیں ان غزلوں میں بھی سلاست و سادگی رواں دواں ہے۔
 غزلوں کے علاوہ فرہای کے دیوان میں چند مسلسل نظمیں بھی ہیں ایک نظم پیش خدمت ہے جس میں مولانا فرہای نے چشم بصیرت میں کائنات ارضی کے مختلف مناظر پر غور کرنے کی دعوت دی ہے:

بکشائے بامداد این مژگان را
 بگازار سر بہ بالین نادان را
 بارے بیرس از دل دانش خواہ
 کنز پرسش سست مایہ سخندان را
 بویا کہ کرد یاسمن و گل را
 گویا کہ کرد بلبل خوشخوان را
 مولانا فرہای کی یہ طویل فارسی نظم ہے اور پوری نظم میں زبان کی نزاکت جلوہ گر ہے اسی طرح فرہای کی ایک دوسری نظم ہے جس کے چند اشعار حاضر خدمت ہیں:

بندر اندر جہاں بہ ژرف نگاہی
 تا بدانی سپید راز سیاہ

در نکویان نہفتہ بد باشند در بدان ہم نکو بود گہ گاہ
 اے بسا ماہر وے تیرہ درون وے بسا تیرہ روعے دل چون ماہ
 اے بسا رند یار سا جامہ وے بسا یار سامے رند کلاہ
 اے بسا شہر یار دوست تمہی وے بسا رہ نمائے خود گمراہ
 اس نظم میں فراہی نے دنیا کی سچائی کا نقشہ کھینچا ہے اور ظاہری وضع قطع اور شکل شہادت کی حقیقت کیا ہے اور اس کا انجام کیا ہوگا
 بڑے ہی لطیف انداز میں بیان کیا ہے یہ نظم اہل دنیا کی رنگینیوں کی ایک بہترین مثال پیش کرتی ہے۔

قصیدہ، مرثیہ، غزل اور مسلسل نظموں کے علاوہ اس دیوان میں جان و دل، آواز سر و شہ بازگشت، زشتی و زیبائی، نیستی و ہستی کے
 عنوانات سے مولانا فراہی نے مثنوی کے نمونے پیش کئے ہیں جس سے ان کی دقت نگاہ اور نزاکت خیال کا اندازہ ہوتا ہے اور زبان و بیان کی
 سلاست و شیرینی اہل زبان کو بھی مات کر رہی ہے مثنوی نیستی و ہستی میں کمال کا جو ہر اس طرح دکھاتے ہیں۔ چند اشعار پیش ہیں:

نیستی تخم است و ہستی شاخ و بر زندگی چون مرغ و مرغش و بال و پر
 تخم ہر مرگے بر آرد زندہ از پس ہر گریہ زاہد خندہ
 تا نگریہ ابر کے خند و چمن تا نخوشد مغز کے جوشد سخن
 مولانا فراہی کے یہ اشعار اس امر کے ثبوت کیلئے کافی ہیں کہ مولانا نہ صرف شاعر تھے بلکہ حکیمانہ نظر بھی رکھتے تھے۔
 مولانا فراہی نے سپاس بزدان کے عنوان سے بارگاہ خداوندی میں اپنا جو جذبہ تشکر و نیاز پیش کیا ہے ان کے بھی اشعار ملاحظہ ہوں
 جو کہ فارسی شاعری میں ایک حسین اضافہ ہے:

اے فرزندانہ بلند سپہر بہ ائے فروزندانہ ستارہ و مسہر
 آفریندہ جہان از بیچ باچنین کاگاہ بیجا بیچ
 پہن ترزاں کشادہ بازار کہ خرد گرد او کشد پر کار
 در محیط کہ کلک صنع نویست چرخ چون نقطہ نہ نیست نہ تیسست
 ہر چہ جز تست آفریدہ تست بہ نیک و بد ہر دور پر وریدہ تست
 گر چہ پاکان نخواندہ یک رادت تا مگس ہم رسیدہ آوازت
 نام تو مرہم است بر دل ریش یاد تو شمع کلبہ دمرویش
 مولانا فراہی کی شاعری کے متعلق مرزا احسان بیگ، مقالات احسان، صفحہ ۳۵۴ پر اس طرح لکھتے ہیں:

”اس میں شک نہیں کہ مولانا کے کلام میں خواجہ حافظ کی قص مستی عرفی کے جوش و بیان یا نظامی کی بلندی تخیل کا سماں نظر نہیں آتا
 لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ جہاں تک اس چیز کا تعلق ہے جس کو فارسیت کہتے ہیں اس کی مثال ہندوستانی شعراء تو درکنار ایران کے قدیم
 اساتذہ فن میں بھی بہت کم نظر آتی ہے۔“